سرسید احمد خان کا اُردو زبان وادب کے فروغ میں حصہ

بختیار حسین ماجد

Abstract:

The scope of Sir Syed's reformation services was very wide and diverse. Fortunately, he got some success on every front. But literature is the only front where not only he got more success than expected but also had to endure such resistances and oppositions. As was the case on other fronts, especially on the religious front. Most of his literary reforms proved groundbreaking in terms of their far-reaching consequences. Sir Syed's thoughts and ideas influenced both the individual and the community at the same time. Friends were affected as well as enemies. Those who did not understand the new situation, ignored the requirements of time and era, their efforts went in vain.The caravan of time moved on and they were lost in the mist. He showed a bright highway to Urdu literature, on which we are two four today with a new observational horizon and a new world meaning. Undoubtedly, the wealth of Sir Syed's services in the galaxy past and present is bright and shining.

(الف) مقالات و مضامین

سرسید کی ادبی خدمات میں سب سے زیادہ مفید، وقیع، اثر انگیز اور عہد آفرین ان کے مقالات و مضامین ثابت ہوئے۔ انہوں نے جہاں مضمون نگاری کو باقاعدگی اور فنی حیثیت عطا کی، خال و خد متعین کئے، رنگارنگ اسالیب پیدا کئے اور فطری لب ولہجے سے آشنا کیا وہیں خیالات و موضوعات کے اعتبار سے بھی اُردو نثر کو گرانقدر اور سرمایہ دار کرنے کی کوشش کی اور مقالات و مضامین میں مذہب، تصوف، تاریخ، فلسفہ، اخلاق، معاشرت، تہذیب و تمدن، ادب و انشاء سب ہی کچھ زیر بحث آئے ہیں۔ فکری سطح پر عقلیت، مادیت، واقعیت، افادیت اور ارضیت کے عوامل سے روشناس کیا۔ اس لئے سرسید کا یہ دعوی غلط نہیں تھا کہ

"مضمون نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اُردو میں نہ تھی یہ اس زمانے میں پیدا ہوئی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔ اگر ہماری قوم اس پر متوجہ رہے گی اور ایشیائی خیالات کو نہ ملائے گی اب حد سے زیادہ امیرن ہو گئے ہیں تو چند روز میں ہماری ملکی تحریریں بھی میکالے اور ایڈیسن کی ہو جاویں گی۔" [1]

اس مقصد کے لیے اسپکٹیٹر کا یہ اصول بھی اپنانے کی کوشش کی کہ وہ اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈال دے گا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملائے گا تا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے بڑھنے والے دونوں باتوں سے نصیحت پاویں۔ انگریزی ماخذ سے استفادہ کرنے کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے سر سید نے لکھا ہے کہ

"ہم نے نامی یورپ کے عالموں ایڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز میں اور اپنی زبان میں لکھا ہے۔ جہاں ہم نے اپنے نام کے ساتھ آر۔ڈی اور ایس ٹی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری اُردو زبان میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی اور سادگی اس میں پیدا کر سکتی ہے۔" [2]

اس بارے ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں۔

"سر سید نے اُردو انشا پردازوں کو مغرب کے ادب عالیہ کی طرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ ان سے فائدہ اٹھا کر اس جہت میں رہنمائی بھی کی۔ سر سید کے بعض مضامین مثلاً "تعلیم" "وحشیانہ نیکی" "سماج" "دنیا"، بہ امید قائم ہے "اخلاق" "ریا" "خوشامد" اسپکٹیٹر سے ماخوذ ہیں۔ رسم ورواج کی پابندی، ' آزادی رائے' کا ماخذ جان اسٹوارٹ مل کی تصنیف لبرٹی ہے۔ "اپنی مدد آپ" سیموئل اسماعیل کی تصنیف "سیلف ہیلپ کے دیباچے سے ماخوذ ہے" [3]

اس لئے یہ بات بلا خوف تردید کی جا سکتی ہے کہ اُردو ادب میں مضمون نگاری کی صنف انگریزی ادب کے توسل سے متعارف ہوئی البتہ اسے مقبول و معروف کرنے میں سر سید نے نمایاں کردار ادا کیا۔ مضمون نگاری کی صنف کو بھی ان کی اولیات میں شمار کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

سر سید کے زیادہ تر مضامین مقالات کی حدود میں آتے ہیں البتہ جن مضامین میں منطقی استدلال کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ہے یا توضیح و استدلال کی جگہ حکائی یا تمثیلی انداز اختیار کیا گیا ہے وہ مضامین انگریزی میں

ESSAY کے تصور سے قریب اور انشائے لطیف کے خانہ میں رکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے مضامین تعداد میں کم ہیں مگر موضوعات اور اسالیب بیان کے اعتبار سے رنگا رنگ اور بحیثیت مجموعی اُردو کے کلاسکس قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

سر سید کے مضامین میں توضیحی اور بیانیہ نثر کے متعدد اسالیب ملتے ہیں۔ علمی مضامین میں زیادہ تر توضیحی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ خیالات کی وضاحت اور صراحت کے لئے استدلال کے نئے نئے طریقے آزماتے ہیں۔ مافی الضمیر کو اتنی مثالوں اور ایسی دلیلوں سے سمجھاتے ہیں کہ موضوع کا کوئی گوشہ ایسا باقی نہیں رہ جاتا جو ابلاغ کی روشنی سے منور نہ ہو گیا ہو یہاں تک کہ دلائل کی کثرت اور مثالوں کی بھرمار سے بسا اوقات اکتاہٹ بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

بیانیہ میں سر سید کا قلم بڑی روانی کے ساتھ چلتا ہے اس اسلوب کے تحت لکھے گئے مضامین میں ایجاز و اختصار خاص طور پر مد نظر رہتا ہے۔ علاوہ بریں اظہار کے جو نئے نئے پیرائے آزماتے ہیں ان میں حکائی، تمثیلی، مکالماتی، ڈرامائی اور محاکاتی انداز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ توضیحی نوعیت کی تحریروں میں تمثیلی پیکر کا استعمال توضیحی استعارے، تلمیحات کثرت سے موجود ہیں۔ کہیں کہیں خود کلامی اور بلند آہنگ سوچ کا لہجہ بھی ملتا ہے اس طرح بعض مضامین میں کسی ایک پیرائے پر مستقل کاربند رہنے کی جگہ موقع سے پیرائیہ تبدیل ہو جاتا ہے یا مختلف پیرائیوں کو ملا کر ایک نیا پیرائیہ (امتزاجی اسلوب) وضع کرنے کا رجحان بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً مضمون "گزرا ہوا زمانہ" سر سید کے حکائی، تمثیلی و انشائی اسالیب کی عجیب و غریب جلوہ گاہ ہے۔ اس میں مختلف پیرائے اس طرح باہم شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ کہیں سے بے ربط معلوم نہیں ہوتے۔ اس مضمون میں ایک متعین مقصد کے حصول اور مخصوص تاثر کو موثر انداز میں بیان کرنے کی غرض سے مختلف تخلیقی وسائل کامیابی کے ساتھ بروئے کار لائے گئے ہیں۔ لیکن اب وجہ شکایت فی سبیل اللہ ہے اس لئے تحریر کا وقار واپس لوٹ آتا ہے۔ لکھتے ہیں۔

> "مگر جناب سید الحاج کو معلوم کرنا چاہیے کہ حج و زیارت میں جو بشارتیں آپ کو ملی ہوں اور جو خطاب آپ کو ملا ہو جن کا تذکرہ آپ دن رات فرمایا کرتے ہیں اور حج سے آپ کے سب گناہ معاف ہو گئے ہوں اور شبلی و جنید کے مرتبے پر پہنچ گئے ہوں بلکہ اس سے اعلیٰ مگر حق العباد نہ کبھی حج سے بخشے جاتے ہیں اور نہ کسی بشارت سے۔ آپ نے جو اتہام مجھ پر کئے ہیں جب تک میں ہی معاف نہ کروں، معاف نہیں ہو سکتے ہیں۔ اقتضائے ایمانداری یہ ہے کہ آپ دوبارہ حج در احمد

کا احرام باندھئے اور گناہوں کی معافی چاہئے ورنہ روز جزا کو آپ کو اپنی ساری کرتوتوں کا مزہ معلوم ہو جائے گا۔ ''۴

سر سید کے مضامین میں طنزیہ پیرائے اور جستہ جستہ لطیف طنز بھی ملتے ہیں ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

''ارسطو کچھ ہمارا مذہبی پیشوا نہ تھا جو ہم اس کے علوم اور اس کے فلسفہ کو ناقابل غلطی کے سمجھیں۔ بو علی کچھ صاحب وحی نہ تھے کہ اس کی طب کے سوا اور کسی کو نہ مانیں، جو علوم دینوی ہم مدت دراز سے پڑھتے آئے تھے اور جو اپنے زمانے میں ایسے تھے کہ اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے، انہیں پر پابند رہنے کے لئے ہم پر کوئی خدا کا حکم نہیں آیا تھا۔ پھر کیوں ہم اپنی آنکھ نہ کھولیں اور نئے نئے علوم اور نئی نئی چیزیں جو خدا تعالیٰ کے عجائب قدرت کے نمونے ہیں اور جو روز بروز انسان پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں ان کو کیوں نہ دیکھیں۔''۵

واضح رہے کہ یہاں طنز کا پیرایہ لطف بیان کا ذریعہ ہی نہیں توضیح واستدلال کا یک حربہ بھی ہے۔ بعض مضامین میں حسب موقع اور بشرط ضرورت خالص طنز کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ایک مضمون میں اپنے مخالف مولوی بخش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔''سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی، کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔'' ۶

اس کے علاوہ بعض مضامین اول تا آخر طنزیہ پیرائے میں بھی لکھے گئے ہیں۔ سر سید کے بعض مضامین میں منظر نگاری کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ حکائی اسلوب پر مشتمل ایک مضمون میں مظاہر فطرت کی مرقع کشی ظاہر کرتی ہے کہ منظر نگاری کے فن میں سر سید کو کتنا کمال تھا۔ مضمون کا پہلا گراف دیکھئے۔

''شہر اور آبادی سے دور جنگل اور میدان سے ہوتے ایک نہایت خوشنما پہاڑ تھا چوٹی سے نیچے تک جا بجا قدرتی پھول کھلے تھے۔ بلندی پر یہی پھول آسمان کے تاروں کا لطف دکھاتے اور بستی کے پھول گلستان یاد دلاتے تھے۔ چوٹی برف سے سفید تھی۔ سر جیوں پانی کی لٹیں بہتی تھیں۔ دور سے قیاس ہوتا تھا کہ یہ ایک مقدس پہاڑ ہے''۷

آئندہ سطور میں زاہد اور فلاسفر کے خیالات اور انداز فکر کے باہمی تضاد کو ظاہر کرنے کے لئے مظاہر فطرت سے جن جزئیات کا انتخاب کیا گیا ہے اور جیسی فضا بندی کی گئی ہے اس سے بیان میں واقعیت کا رنگ تو پیدا ہوا ہے، ہی ایجاز وبلاغت کا حسن بھی پیدا ہو گیا ہے۔

"اس کے ایک ٹیلے کی اندھیری کھوہ میں ایک زاہد آنکھیں بند کئے خدا کو ڈھونڈ رہا تھا اور تسبیح اور تحلیل میں مصروف تھا۔ نماز کے طلبگار ہوتے تھے۔ کبھی کہتے تھے کہ اگر یہ پیغمبر ہیں تو کیوں نہیں ان کے پاس فرشتے آتے، کیوں نہیں ان کے پاس خزانہ اتارا گیا؟ کبھی کہتے تھے کہ یہ تو عام انسانوں کی طرح کھاتے پیتے ہنستے ہیں، بازاروں میں پڑے پھرتے ہیں۔ انسانوں سے زیادہ کوئی بات ان میں نہیں ہے"۔

اس کے برخلاف شخصی اور تاثراتی نثر کا انداز بھی کم دلاویز نہیں۔

"تم کو کس نے جگایا؟ دل اور زمانے نے دل کی گھڑت ایسی کی تھی جس میں ہمیشہ غم خواری تھی پر سوتا تھا زمانے نے جھٹکا دیا اور جگا دیا۔ دفعتاً دیکھا کہ دنیا الٹ گئی اور رنگ برنگ کی پھلواری سب اجڑ گئی۔ قوم کی حالت وہ دیکھی کہ خدا کسی کو نہ دکھلائے۔ اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائیں۔"۸

مندرجہ بالا مطالعہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ سرسید کے مقالات و مضامین میں اُردو نثر کا حیرت انگیز تنوع ملتا ہے۔ ان مقالات و مضامین کی نثر بنیادی طور پر علمی یا ترسیلی ہوتی ہے۔ سرسید کے یہاں ادبی نثر بھی نایاب نہیں، البتہ کم ضرور ہیں لیکن یہ کمی عجز کلام کی دلیل نہیں کہی جا سکتی۔ واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی۔ اگر وہ تاثراتی، تخلیقی، تخیلاتی اسالیب کی طرف خاطر خواہ توجہ کرتے تو تخلیق ادب کے عمدہ نمونے چھوڑ جاتے۔ تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اپنے مقالات و مضامین کے ذریعے عصری ادب پر بعض اہم اثرات مرتب کئے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ "معجزات و کرامات" مشمولہ 'تہذیب الاخلاق' میں لکھتے ہیں: "تحریر کی جذباتی بنیادوں کی اہمیت جتلائی اور ثابت کیا کہ تحریر میں اثر باہر سے نہیں آتا اس کا سرچشمہ لکھنے والے کے قلب میں ہے"۹

اس کے علاوہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موجود نثری ادب کے بیشتر اصناف اور اسالیب کا سرچشمہ سرسید کے مضامین ہی ہیں۔ خاص طور پر جدید افسانوی ادب کو ان کے مضامین سے بڑا فیض پہنچا۔ انہوں نے اردو نثر کے جو نمونے چھوڑے ان کی بدولت آنے والے دنوں میں مختصر افسانہ، انشائی، خاکے اور ناول وغیرہ قسم کے نثری اصناف ادب میں ترقی کے امکانات روشن ہوئے۔

(ج)مکتوب نگاری

نثری ادب میں مکتوب نگاری کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ صنفی حیثیت سے ادب کا جزو نہ ہونے کے باوجود بھی یہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کا لازمی حصہ اور قابل فخر سرمایہ رہی ہے۔ موضوع اور طریقہ اظہار کے لحاظ سے اس کی نوعیت، افادیت، حیثیت اور اہمیت و افادیت کا تعین ہوتا ہے۔ فنی اور ادبی اعتبار سے خطوط شخصی اظہار کا بہترین وسیلہ ہیں۔ اس بنا پر ان میں وہ تمام انشائی عناصر شامل ہوتے ہیں جو ایک تخلیقی نثر میں لازماً موجود ہوتے ہیں۔ فنی سطح پر ایک تخلیقی تجربہ ہونے کے علاوہ مکاتیب، تاریخ و سوانح کے بنیادی مآخذ بھی رہے ہیں۔

شاعری کی طرح مکتوب نگاری بھی مخصوص فنکارانہ صلاحیتوں کی متقاضی ہوتی ہے اس کے لئے سلیقہ اور شخصیت دونوں درکار ہوتے ہیں۔ خطوط کی مقبولیت اور دلچسپی کا راز یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں مکتوب نگار کی ذات کے اندر جھانکنے اور اسے بے پردہ دیکھنے کا موقع ملتا ہے یہ مواقع اس لئے میسر آتے ہیں کہ مکتوب نگار اور مکتوب علیہ کے درمیان تیسرا کوئی نہیں ہوتا اگر کوئی چیز درمیان ہوتی ہے تو محبت اور اعتماد۔ اس لئے مکتوب نگار کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے۔ زندگی کے سب راز و نیاز، طبیعت کی شوخی اور افتادگی، کمزور لمحات کی تصویریں، سرشاری اور شادمانی پر مبنی تجربات کا بیان جس بے تکلفی اور سچائی سے کرتا ہے وہ عام حالات میں ممکن نہیں ہوتے۔

خطوط ہمیشہ ذاتی ہوتے ہیں۔ اس لئے ان میں سچائی اور خلوص ہوتا ہے کیونکہ اپنے آپ سے اور اپنوں سے جھوٹ بولنے یا کچھ چھپانے کا رجحان انسانوں سے بعید اور انسانیت کے خلاف ہے۔ ریا اور تکلف کا محل خطوط نہیں ہوتے۔ غیر ذاتی تحریریں دلچسپ تو ہو سکتی ہیں مگر خطِ نہیں۔ اس نوع کی تحریریں خط کے فارم میں ہو کر بھی خط کا مرتبہ حاصل نہیں کر پاتیں۔

اُردو میں مکتوب نگاری کی روایت مرزا غالب نے قائم کی۔ اس سے قبل علمی تحریروں اور مکتوب نگاری کے لئے فارسی کا استعمال ہوتا تھا۔ غالب کے ابتدائی مکاتیب بھی فارسی ہی میں ہیں۔ ۱۸۵۰ء کے آس پاس غالب نے اُردو میں خط لکھنا شروع کیا۔ ان خطوط میں مروجہ اصول و ضوابط سے انحراف کرتے ہوئے سادگی بے تکلفی، شوخی و ظرافت، محاکات اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مراسلات کو مکالمات کے انداز میں لکھنے کی جدت کی جس سے شخصی اظہار کے مختلف اسالیب پیدا ہوئے اور مکتوب نگاری باقاعدہ ایک فن بن گئی۔ غالب نے اپنے

رنگ میں طرح طرح کے مراسلات لکھے، آپ بیتی اور جگ بیتی سنائی اور انشاء پردازی کے جوہر دکھائے۔ بالآخر اس فن کے موجد اور امام قرار پائے۔ غالب کی تقلید میں ان کے ہم عصروں نے بھی سادہ نگاری اور بے تکلف پیرائیہ بیان اختیار کیا۔

انیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں سر سید نے بھی اُردو میں خطوط لکھے اور یہ خطوط کئی باتوں میں بظاہر غالب کے خطوط سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

سر سید کے یہاں زیادہ تر خطوط اس قومی تحریک سے متعلق ہیں جس کے وہ بانی اور علمبردار تھے۔ ان کے خطوط میں ایک خاص مقصد کی تابع داری یا مشروطیت ہر جگہ نمایاں نظر آتی ہے۔ کہیں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو معمولات زندگی کے خلاف ہو۔ ان کا ظاہر و باطن ایک سا تھا۔ لیکن خطوط میں انہیں قریب سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ان خطوط میں وہ ہنستے بولتے، خوش اور رنجیدہ ہوتے نظر آتے ہیں۔ کبھی غیرت ملی سے مضطرب، قوم کے غم میں نڈھال، دوستوں کی غم خواری اور دل جوئی، محتاجوں سے صلہ رحمی، بزرگوں کا احترام، عزیزوں سے شفقت، بے تکلف دوستوں سے شوخی اور لطیف چھیڑ چھاڑ (جو کسی نہ کسی اصلاحی نکتے پر منتج ہوتی ہے) وغیرہ کتنے ہی رنگ ہیں جو عام زندگی میں صاف دکھائی نہیں دیتے لیکن ان خطوط میں بھرپور تنوع اور رنگ رنگ کیفیات کے ساتھ موجود ہیں۔

غالب اور سر سید کے خطوط میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ زبان و بیان کا جو لطف اور ادب کی جیسی چاشنی غالب کے خطوط میں پائی جاتی ہے۔ سر سید کے خطوط اس پائے تک نہیں پہنچ پاتے اور شاید ایسا ممکن بھی نہ تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ دونوں کی شخصیتیں جداگانہ تھیں۔ مقصد حیات اور تصور زیست بھی الگ الگ تھے۔ غالب شاعر اور انشاپرداز تھے۔ اندازیت پسندی ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ بنیادی طور پر فنکار، جمال پرست اور آزاد منش انسان تھے۔ وہ حال میں جیتے تھے اور عمر گریزاں کے ایک ایک لمحے سے عیش و مسرت اور کیف و سرشاری کا خراج وصول کرنے کے عادی تھے۔ عہد امروز انہیں غم فردا کی طرف جھانکنے کی مہلت نہیں دیتا تھا۔ سر سید کی شخصیت کئی اعتبار سے متضاد نظر آتی ہے۔ وہ بنیادی طور پر سوشل رفارمر تھے۔ ان کا اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ سب کچھ قوم اور قومی تحریک کے لئے وقف تھا۔ ان کا ظاہر و باطن ایک سا تھا اس لئے تصویر کے دونوں رخ ایک ہی خدوخال پیش کرتے ہیں۔ چونکہ شخصیت میں پیچیدگی یا تہ داری بالکل نہیں تھی، اس لئے بودہ داری کا سوال ہی نہین اٹھتا۔ ان کی شخصیت تضادات سے عاری اور تحریریں باعتبار

کیفیت رنگا رنگی اور بوقلمونی کا نگار خانہ ہیں۔ ان کے خطوط میں ادبیت کی چاشنی کم ضرور ہے، لیکن مقصد کی عظمت اور موضوع کا شکوہ ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کا اپنا ذاتی رنگ ہے جو مخاطب کے خلوص سے خود رنگ اور موضوع کی تکرار کی بنا پر بے رنگی کا التباس پیدا کرتا ہے۔ سرسید متعصب ادیب نہیں تھے۔ لہذا جو کچھ ادب براہ راست یا بالواسطہ تخلیق کیا ہے، اسے نعمت غیر متوقع سمجھنا چاہیے۔ قدرت نے انہیں تخلیقی ذہن اور فنکارانہ صلاحیتیں توضرور بخشی تھیں، لیکن حالات نے ان کے اندر کے فنکار کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔

اصلاح و تبلیغ کی بھاری چٹانیں سد راہ بنیں اور وہ بہت بڑے ادیب یا انشاپرداز نہیں بن پائے تاہم انہوں نے جو کچھ بھی لکھا ان سے اُردو نثر کو بڑا فائدہ پہنچا۔ انہوں نے اُردو مکتوب نگاری کو زبان کی سادگی، مضمون کو قطعیت اور مخاطب کو حظ دیا۔ اس کے علاوہ یہ خطوط پچھلی صدی میں مسلمانان ہند کے قومی و تمدنی مسائل خصوصاً سرسید اور علی گڑھ تحریک سے متعلق نہایت قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔

مندرجہ بالا عنوان و بیانات میں مکاتیب سرسید کی افادیت و معنویت کے تقریباً سب ہی امکانی زاویے روشن ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے خطوط زبان و ادب، علم و عمل کا گنجینہ ہیں، سیرت و اخلاق کا مآخذ اور طرز بیان و افتاد طبع کے مظہر ہیں۔ یہ خطوط بیان کا ایجاز، زبان کی سادگی، مضمون کی قطعیت اور آخر کار سرسید اور ان کی قومی تحریروں کی اہم دستاویزات کے طور پر بھی ہمیں ملتے ہے۔

غالب کی طرح سرسید کے یہاں بھی القاب وآداب میں جدت و اختراع اور انداز تخاطب میں سادگی اور خلوص، بے تکلفی و اپنائیت اور کبھی کبھی والہانہ پن تک کا رجحان ملتا ہے۔ مختصر اور بے ساختہ القاب سرسید نے بھی استعمال کئے ہیں مثلاً ”بھائی“ ”مخدومی“ بھائی مشتاق حسین“ ”مکرمی زینو“ اور ”زینو بھیا“ وغیرہ خاص طور پر دوستوں کو مخاطب کرتے ہوئے خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور بسا اوقات بے تکلفی کے ساتھ مکالماتی انداز بھی اختیار کرتے ہیں مثال کے طور پر

> ”واہ واہ جناب محسن الملک واہ واہ۔ عنایت نامہ رجسٹری شدہ پہنچا الٹی شکایت۔ متعدد خط بھیجے ایک کا بھی جواب نہیں آیا۔ تار تک کا جواب مرحمت نہیں ہوا اور ہم کو لکھا جاتا ہے کہ تم بھول گئے اور خط نہیں لکھا۔ واہ حضرت واہ۔ بہر حال آپ کا عنایت نامہ آیا خدا کا شکر کیا آپ خوش ہیں اچھی طرح ہیں یہی ہم چاہتے ہیں۔ “[۱۰]

اور اب انداز تخاطب کا یہ والہانہ پن بھی ملاحظہ ہو جو وہ اپنے دوست محسن الملک کے ایک مضمون کو پڑھ کر اختیار کرتے ہیں۔

"مرشدنا و مولانا میں نے آپ کا فرمان عالی شان کا ایک حصہ جو ۲۹ اپریل کے اخبار میں چھپا متعدد دفعہ پڑھا۔ سبحان اللہ، سبحان اللہ، واہ واہ واھوا واھوا، کیا خوب اور کیا عمدہ ہے جس پر بالکل ایمان رکھتا ہوں اور آئندہ مضمون پڑھنے کا نہایت مشتاق ہوں۔"۱۱

کبھی کبھی بغیر القاب بھی خط لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

"میرا دل تم سے صاف ہو گیا۔ مہدی حسن کے سامنے میں نے تم کو بہت برا بھلا کہا اور بخارات نکال لئے اس لئے میں تم کو وہی القاب لکھتا ہوں جو پہلے لکھتا تھا۔"

"عزیزی و مکرمی مولوی مشتاق حسین۔ ایک پارسل بیس رسالوں کا وہلو سے اپیل روانہ کیا ہے اس کو پانچ روپیہ دو آنہ دے کر لے لو"۔ ۱۲

سر سید کے مکاتیب کی ایک نمایاں خصوصیت شوخی اور ظرافت بھی ہے ذیل کی سطور میں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

سفر لندن کے دوران سر سید نے گردن مروڑی ہوئی مرغی کھالی اور بے جھجھک محسن الملک کو سارا واقعہ لکھ دیا۔ کچھ چھپانے کی کوشش اس لیے نہیں کی کہ یہ سر سید کی طبعیت سے بعید تھا۔ اس کے علاوہ وہ انگریزوں کے ذبیحے کو ناجائز بھی نہیں سمجھتے تھے۔ حالانکہ محسن الملک قطعی ناجائز قرار دیتے تھے۔ اس پیش منظر میں ذیل کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"ہم کو اپنے خدا سے معاملہ ہے جس کے ہاتھوں ایسے تنگ آئے ہیں کہ کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جو کام کرتے ہیں وہ دیکھتا ہے۔ جو بات کہتے ہیں سن لیتا ہے جو دل میں لاتے ہیں جان لیتا ہے ایسا پیچھے پڑا ہے کہ نہ جہاز پر چھوڑے نہ زمین پر چھوڑے نہ رات کو اور نہ دن کو الگ ہوا۔ نہ غیر ذبح مرغی کھاتے وقت پیچھا چھوڑے۔ پس میں نے نہایت سچے دل اور درست اعتقاد سے ایسے دوست اور سچے رفیق خدا سے شرم نہ کی تو پھر بھائی مہدی علی سے کیا ڈرتا۔ میں اس کو قرآن مجید سے جائز سمجھتا ہوں نہ کہ روایت سے۔۔۔ والی مصر کے ساتھ علمائے مصر بھی تھے۔ انگریزوں کے ساتھ بغیر ذبح کئے ہوئے جانور چٹ کرتے تھے۔"۱۳

ایک اور خط میں محسن الملک کو دعا دیتے ہیں۔ ”او خدا تو ان کا بھی خدا ہے جو حلال کی ہوئی مرغی کھاتے ہیں اور ان کا بھی خدا ہے جو گردن مروڑی ہوئی مرغی کھاتے ہیں۔ مجھ مری مرغی کھانے والے کی بھی دعا قبول کر۔“۱۴

سر سید کے قیام انگلستان کے دوان سر سید کے مخالفین نے یہ افواء پھیلا دی کہ انگلستان پہنچ کر انگریزی وضع اختیار کرلی ہے اس سلسلے میں محسن الملک نے بھی استفسار کیا۔ جواب میں لکھتے ہیں۔

> ”تبدیل وضع کے باب میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، سب بجا ہے بشر طیکہ میرا اجادو توبہ توبہ میرا معجزہ نعوذ باللہ، میری کرامت لاحول ولا قوۃ، اللہ باللہ، میری حماقت تم میں اثر نہیں کرے گی ذرا صبر کرو تین مہینے خبر سے گزر جاویں۔ جب الہ آباد اسٹیشن پر گلے ملوگے اور چھاتی سے چھاتی ملے گی اس وقت پوچھیں گے کہ جان من (معاف کیجیے بے خودی میں یہ لفظ نکل گیا) قبلہ من اب کیا ارشاد ہے۔ “۱۵

محسن الملک نے سر سید کے نام ایک خط میں انہیں تقلید سے منحرف ہونے پر کچھ طعن و تعریض کی تھی جواب میں سر سید جو پیرائیہ بیان اختیار کرتے ہیں وہ ظرافت سے شروع ہو کر نصیحت پر ختم ہوتا ہے لکھتے ہیں۔

> ”قیامت کے دن جب خدا تعالیٰ مسلمان تیلی جولاہوں، ناخواندہ یا کم علم مسلمانوں کو سزا دینے لگے گا تو بندہ سامنے ہو کر عرض کرے گا جناب باری انصاف فرمایئے ان بے چاروں کا کیا قصور ہے۔ یہ تو حضور خود بدولت ہی کی تقصیر معلوم ہوتی ہے کہ ان کو ایسا مذہب دیا تھا جس کے حل کرنے اور سمجھنے میں جناب قبلہ و کعبہ مولوی سید مہدی علی صاحب جگر گوشہ رسول مقبول علیہ الصلواۃ والسلام بھی اپنے تئیں لائق نہ سمجھتے تھے۔ پھر بے چارے غریب کیا کرتے۔ جناب مذہب اسلام تو آفتاب سے بھی روشن اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ کوئی معما یا کوئی مشکل شعر نہیں ہے جس کے حل کرنے مولوی امام بخش صہبائی اور میر حسن معمائی درکار ہوں۔“۱۶

سراج الدین احمد ایڈیٹر سرمور گزٹ کو اپنے بد خواہوں کی مذمت کرنے سے باز رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

”جانے دو جن کا جو دل چاہے کہے۔ ہمارا کیا بگڑ تا ہے اگر ہمیں برا کہنے سے ان کا دل خوش ہوتا ہے سوں کر لینے دو تم بھی ان کے برا کہنے پر خوش ہو کیونکہ وہ ہمارے دھوبی ہیں ہم کو گناہوں سے پاک کرتے ہیں۔ “۱۷

سر سید کے یہاں ظرافت کے مختلف انداز ہیں مگر وہ انداز کثرت سے ملتا ہے جس میں وہ خود کو نشانہ بناتے ہیں ذیل کی مثال ملاحظہ ہو۔

”آپ کو معلوم نہ ہو گا مگر آپ معاف فرمایئے گا کہ میں نے وھابیوں کی تین قسم قرار دی ہیں ایک وھابی، دوسرے وھابی اور کریلا۔ تیسرے وھابی کریلا اور نیم چڑھا۔ میں اپنے تئیں تیسری قسم قرار دیتا ہوں۔ “۱۸

سر سید کے خطوط سے ان کے ذوق شعر و ادب اور ادبی تصورات پر بھی روشنی پڑتی ہے یہ خطوط تعداد میں بہت تھوڑے ہیں لیکن ادبی تحقیق کے نقطہ نظر سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

مکتوب نگاری دراصل غالب کا میدان ہے۔ وہ اس فن کے امام تھے۔ اُردو میں ادبی خطوط کی بنیاد غالب نے ہی ڈالی۔ غالب اور سر سید کے خطوط کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ دونوں کے میدان کار اور مقاصد جداگانہ تھے۔ تاہم بعض باتوں میں سر سید کے خطوط خصوصی اہمیت کے حامل میں مثلاً

”خطوط سر سید کا کینوس خطوط غالب کی نسبت زیادہ وسیع ہے خطوط غالب کی ورق گردانی کیجئے تو غالب کو گھر کے بے تکلف ماحول میں دیکھ لیجیے، سفر و حضر میں ان سے مل لیجئے، دوستوں کے جھرمٹ میں دیکھ لیجئے، ان کی آنکھوں سے دلی کی تباہی و بربادی کا جائزہ لے لیجئے، سر سید اپنے خطوط میں ایک کائنات کی سیر کراتے ہیں۔ ملکوں کا حال، قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں، مذہبی، ادبی، سیاسی مسائل۔۔۔ کیا ہے جو ان خطوط میں نہیں ہے۔ پھر یہ کہ نثر نگاری کے جتنے اسلوب سر سید کے خطوط میں نظر آئے ہیں کہیں اور یکجا نہیں مل سکیں گے۔ “۱۹

غالب کے خطوط کی نثر تخلیقی اور شاعرانہ ہے اور ان میں بالارادہ انشاء پردازی سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف سر سید کے خطوط مخصوص مقاصد اور ضروریات کی پیداوار ہیں۔ غالب ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''ازل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں مگر ناتوان و ست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا، حافظے کو رو بیٹھا۔ کبھی اٹھتا ہوں تو بہ تکلیف اتنی دیر میں اٹھتا ہوں ۔جتنی دیر میں قد آدم دیوار اٹھتی ہے'' ۲۰؎

بقول ڈاکٹر نورالحسن نقوی

''اس عبارت پر اس طرح داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ جیسے شعر پر۔ ہمارا ذہن غالب کی بیماری اور ناتوانی کی طرف نہیں جاتا نثر کے حسن میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو یہاں ادیب اور انشاء پرداز غالب کامیاب ہو گیا۔ مراسلہ نگار غالب ناکام۔ سرسید کا قاری نفس مضمون سے اپنی توجہ ہٹا نہیں سکتا۔ غالب کے خطوط میں کہی گئی بات چاہے یاد رہے یا نہ رہے مگر ان کی عبارت اور ان کے الفاظ ذہن سے محو نہیں ہو سکتے۔ ہو سکتا ہے سرسید کی عبارت کا ذرا سا حصہ بھی ذہن میں نہ رہے مگر ان کی بات ذہن نشیں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' ۲۱؎

اس کے برعکس سرسید بحیثیت مراسلہ نگار اکثر کامیاب نظر آتے ہیں۔

''پیارے مہدی آپ جانتے ہیں نبی آخر الزمان ﷺ کو اس رکھنے میں کیا مصلحت تھی اس میں بھی حکمت تھی کہ نیچرل فیض جو اندرونی چشموں سے جاری ہوتا ہے، اس کو کوئی بیرونی چیز مزاحم نہ ہو اور جو کچھ باہر نکلے خالص بے میل ہو۔ پس ہمیشہ نیچر کے سرچشمہ کے جاری رکھنے کی طرف متوجہ رہا کریں۔ ''۲۲؎

اپنے بہت ہی قریبی دوست زین العابدین کے نام ایک خط کا آغاز سرسید حسب ذیل انداز میں کرتے ہیں۔

''مکرمی زینو بھیا ابھی تمہارا خط پہنچا اور ابھی جواب لکھنا شروع کیا زبان کھجلاتی ہے اور کوئی یہاں نہیں ہے جس کو برا کہوں۔ دل میں غصہ آتا ہے اور کوئی یہاں پر نہیں جس پر غصہ نکالوں۔ تمہارے جانے سے مکان خالی نہیں ہوا بلکہ دل سونا ہو گیا ہے۔ صبح اٹھ کر خدا یاد نہیں آتا مگر تم یاد آتے ہو۔ ''۲۳؎

تخاطب کا یہ خلوص سر سید کے اکثر خطوط میں جادو کا کام کرتا ہے ان خطوط کے ذریعے وہ اپنے دوستوں کا دل مٹھی میں رکھتے ہیں۔ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:۔

"سر سید اُردو نثر کے بہت بڑے معمار ہیں بلکہ جدید نثر کے بانی کہے جاسکتے ہیں۔ خود ان کی تصانیف میں ادب، تحقیق، علم الکلام، صحافت، انشاپردازی سبھی کے نمونے ملتے ہیں۔ وہ نثر کی روح کو سمجھتے ہیں۔ اور اس کے تعمیری حسن کو جانتے ہیں" ؎۲۴

مولوی عبدالحق۔ "چند ہمعصر" میں لکھتے ہیں۔

"مضمون نگاری خصوصی طور پر سر سید کی مصلحانہ کاوشوں اور ناصحافہ فکر کی عکاسی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ تہذیب الاخلاق میں سر سید کے مضامین قدیم مذہبی نظریات معاشرتی اقدار، تعلیمی رجحانات، اخلاق و عادات کے بدلنے میں کتنا زبردست کام کیا ہے مگر اسی کے ساتھ مضمون نگاری کو جو عروج ہوا اور ہمارے ادب کو اس سے جو حسن اور وسعت نظری ملی وہ سر سید کے کارناموں کی اعلیٰ مثال ہے۔ سر سید ہی کے طفیل اُردو ادب میں انیسویں صدی کے نئے تقاضوں کو پورا کرنا سیکھا اور مغربیت سے ہم آہنگی کے لئے اپنی تنگ دامانی کو وسعت دینے کے سامان مہیا کئے۔ نئے اور شاداب پھولوں سے ہمارے ادب کو زینت ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُردو نثر میں جو انقلاب و ترقی ہم اس وقت دیکھتے ہیں وہ سر سید کے طفیل ہے۔" ؎۲۵

تعلیم کا قدیم تصور اس وقت تک صرف اتنا تھا کہ چند مشہور کتابیں پڑھ لی جائیں۔ شاعری صرف شخصی کمالات کا اظہار تھی۔ تاریخ سیرت اور علم و ادب میں اجتماعی تصور معدوم تھے۔ مذہبی تصانیف مشہور روایتوں اور چشم بند تقلید پر مبنی تھیں۔ داستانیں خیال آرائیوں اور ماورائی تصورات سے پر ہوا کرتی تھیں۔ خود سر سید کو اس صورت حال کا شدید احساس تھا۔ چنانچہ قدیم اُردو ادب کے بارے میں ایک جگہ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

"علم ادب و انشاء کی خوبی صرف لفظوں کے جمع کرنے اور مبالغہ آمیز باتوں کے لکھنے پر منحصر ہے۔ یہاں تک کہ دوستانہ خط و کتابت اور چھوٹے موٹے روز مرہ کے نسخوں میں بھی یہ سب برائیاں بھری ہوئی ہیں" ؎۲۶

سر سید نے اصلاح حال کا کوئی رخ نہیں چھوڑا، انہوں نے تعلیم کو سماج وافراد کی تعمیر و ترقی کا آلہ کار قرار دیا۔ مذہب کو عقل کے قریب لائے۔ ادب کو حقیقت شناسی بخش کر اجتماعی تصورات کی مقبولیت عام کی۔ انہوں نے صحیح قدیم روایتوں اور مستقبل کی فکر کو حال سے ہم آہنگ کرنا سکھایا۔ ماضی کی فروعات سے دست بردار ہونے اور اس کی عظمتوں سے رشتہ قائم رکھنے کا طریقہ بتلایا۔ حال کے تقاضوں کو پورا کرنے اور مستقبل کا سامنا کرنے کی سکت پیدا کر دی۔ یقیناً سر سید نے یہ قوت ادب کے ذریعہ پیدا کی۔

نئے نقوش کی رنگ آمیزی کے ساتھ قدیم معاشرہ کو جدید مغربی قدروں سے ہم آہنگ کرنے کی پوری کوشش کی۔ یہ نیا خاکہ اور تصور زندگی گو مغربی طرز کا تھا، سر سید نے ہر کام پر مغرب کی پوری پیروی کی مگر تقلید محض کے طور پر نہیں۔ مغرب علم سائنس میں بہت آگے تھا۔ اس سے استفادہ کرنے کے لے ان علوم کی تحصیل لازمی تھی۔ لہذا تقلید ایک حد تک ناگزیز تھی۔

حوالہ جات:

۱۔ 'تہذیب الاخلاق'، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۷۵ء، ص۸

۲۔ ایضاً

۳۔ محمد صادق، "ہسٹری آف اُردو لٹریچر"، کیلیفورنیا: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۶۴ء، ص۵۳

۴۔ "دافع البہتان"، مشمولہ، 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۷۹ء، ص۹

۵۔ "تکمیل"، مشمولہ، 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۹۰ء، ص۱۵

۶۔ 'تہذیب الاخلاق'، علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۷۳ء، ص۱۱

۷۔ "زاہد اور فلاسفر کی کہانی اور دو سلطنتوں کا مقابلہ"، مشمولہ، 'تہذیب الاخلاق' ۔علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۷۷ء، ص۳۵

۸۔ "معجزات و کرامات"، مشمولہ، 'تہذیب الاخلاق' علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۱۸۷۵ء، ص۱۷

۹۔ ایضاً

۱۰۔ عبداللہ، سید، "نقوش"، مکاتیب، لاہور، ادارہ نقوش ۱۹۷۰ء، ص۳۱

۱۱ ۔ سید احمد خاں، سرخط بنام محسن الملک،"مکاتیب سر سید احمد خان"،مرتبہ، مشتاق حسین، دہلی: انجمن ترقی اردو، ۱۹۶۰ءِ، ص ۸۲

۱۲ ۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۳ ۔ سید احمد خاں، سر، خط بنام محسن الملک، "مکاتیب سر سید احمد خان"، مرتبہ، مولانا شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۲۷۸

۱۴ ۔ ایضاً، ص ۵۸ ۱۵ ۔ ایضاً، ص ۴۷

۱۶ ۔ ایضاً، ص ۶۰

۱۷ ۔ سید احمد خاں، سر، خط بنام سراج الدین،" مکاتیب سر سید احمد خان"، مرتبہ، مولانا شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۵۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۹ ۔ نور الحسن نقوی، ڈاکٹر، "سر سید اور ہندوستانی مسلمان"، علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹ءء، ص ۲۰۶

۲۰۔ غالب، اسد اللہ خان، خط بنام انوارالدولہ شفق، مشمولہ "عکس غالب"، مرتبہ، آل احمد سرور، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۳ء، ص ۲۱۰

۲۱ ۔ نور الحسن نقوی، ڈاکٹر "سر سید اور ہندوستانی مسلمان"، علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاؤس، ۱۹۷۹ء، ص ۲۰۸

۲۲ ۔ سید احمد خاں، سر، خط بنام محسن الملک، "مکاتیب سر سید احمد خان"، مرتبہ، مولانا شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۲ء، ص ۱۷۱

۲۳ ۔ ایضاً

۲۴۔ سرور، آل احمد، "اردو تحریک"، مرتبہ: نسیم قریشی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۲۰۰۰ء، ص ۷۰

۲۵۔ عبد الحق، مولوی، "چند ہم عصر"، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص ۲۴۴

۲۶۔ خاں، عبد اللہ، " مقالات سر سید"، دہلی: انجمن ترقی اردو (ہند)، دہلی، س ن، ص ۹۴